ساحر لدھیانوی

پرچھائیاں

مکتبہ جدید لاہور

قیمت ایک روپیہ

پبلشرز:- مکتبہ جدید-لاہور
پرنٹرز:- سویرا آرٹ پریس-لاہور

مصوّر

ہرکرشن
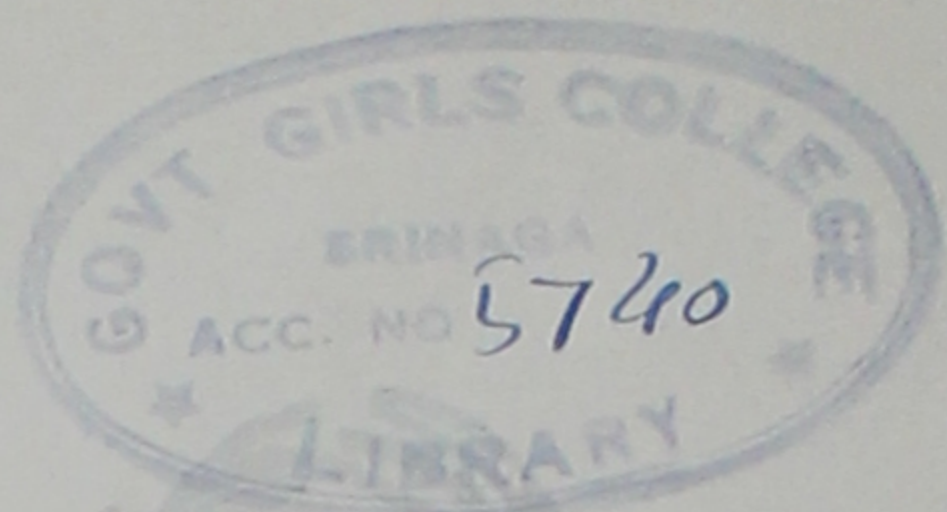
نجمہ سمیع — اور — حامد انصاری

کی ننھی بچی

ساحرہ

کے

نام

ساحر

'پرچھائیاں' میری پہلی طویل نظم ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں امن اور تہذیب کے تحفظ کے لئے جو تحریک چل رہی ہے، یہ نظم اُس کا ایک حصّہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر نوجوان نسل کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ اُسے جو دنیا اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہے، وہ آیندہ نسلوں کو اس سے بہتر اور خوبصورت دنیا دے کر جائے۔ میری یہ نظم اسی کوشش کا ادبی روپ ہے۔

سرورق، اور دیگر خاکے ہرکرشن کی فنّی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جو ہمارے ملک کے ایک ممتاز اور صاحب طرز آرٹسٹ ہونے کے علاوہ میرے بچپن کے دوست اور کالج کے ساتھی بھی ہیں۔ دیباچہ محترم رفیق سردار جعفری نے لکھا ہے۔ میں ان دونوں دوستوں کا شکر گزار ہوں۔
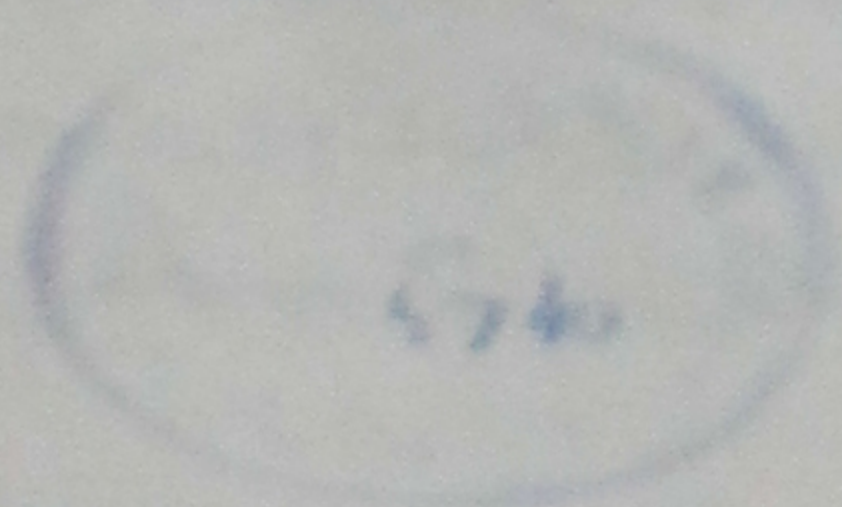
بمبئی

۲۱ نومبر ۱۹۵۵ء

ساحرؔ لدھیانوی

ہے اور محسوس کی ہے اور نظر انداز کی ہے، اپنی رنگین بیانی اور آتش بیانی سے پرکیف بنا دیا ہے۔ اس کی سادگی، اس کے موضوع اور مواد میں ہے۔ اور پُرکاری اس تکنیک میں جو شاعر نے استعمال کی ہے۔ بے خودی اس مکمل ہم آہنگی سے پیدا ہوئی ہے جو شاعر کو اپنے موضوع سے ہے اور اس بے خودی کے عالم میں بھی اُس کے سماجی شعور نے اُسے ہشیار رکھا ہے۔ اگر یہ ہشیاری نہ ہوتی تو رنگین بیانی میں آتش بیانی کی آمیزش نہ ہو سکتی اور نظم کا آخری حصہ نہ لکھا جاتا۔

"پرچھائیاں" ساحر کی بیشتر نظموں کی طرح محاکات کا ایک اچھا نمونہ ہے اور بیک وقت غنائی اور بیانیہ کیفیات کی حامل ہے۔ وہ غنائی کیفیت جو بیانیہ عناصر سے آنکھ چراتی ہے بسا اوقات ذاتی داخلیت کے نہاں خانوں میں جلوے دکھا کر رہ جاتی ہے اور وہ بیانیہ کیفیت جو غنائی عناصر سے گریز کرتی ہے ایک طرح کی ظاہر نگاری میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کی مثال "نہر پر چل رہی ہے پن چکی" سے بہتر نہیں ہوتی۔ ساحر کی یہ نظم اس کی پوری شاعری کی طرح ان دونوں عیوب سے پاک ہے۔

اس محاکاتی کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے ساحر نے لفظوں کے استعمال میں بھی بڑی خوش مذاقی دکھائی ہے۔ اس نے بعض مقامات پر لفظوں سے

نقاشی اور رنگ کاری کا کام لیا ہے اور وہاں اس کا قلم شاعر کے قلم کے بجائے مصور کا موقلم بن گیا ہے۔ الفاظ جو چند حروف کی اجتماعی شکلیں ہیں پگھل کر رنگ اور خطوط میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور کاغذ کے صفحہ پر ایک منظر کھینچ دیتے ہیں۔ ان کی صوتی کیفیت میں بھی ٹکراؤ اور جھنکار کے بجائے ایک خاموش اور بے آواز روانی ہے۔ جیسے صاف اور چکنی سطح پر آہستہ آہستہ پانی بہ رہا ہو۔

میں نے "پرچھائیاں" پڑھنے سے پہلے اس نظم کو مختلف جلسوں اور مشاعروں میں ساحر کی زبان سے کئی بار سنا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ اس کی اثر آفرینی کسی ایک طبقے یا گروہ تک محدود نہیں ہے۔

اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی اور بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ اس کا موضوع اس عہد کا سب سے اہم سوال ہے جس کا جواب ساری انسانیت کو دینا ہے اور "عالمی امن تحریک" اس پر شاہد ہے کہ اس کا جواب ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل، ہر رنگ، ہر طبقے، ہر مکتب خیال کے آدمی نے ایک ہی طرح دیا ہے۔ دنیا کی نصف سے زائد آبادی نے امن عالم کے محضر پر اپنی مہر ثبت کی ہے۔ ساحر لدھیانوی نے یہ خوبصورت نظم لکھ کر اپنے دستخط کئے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ساحر نے اپنی بات ایک کہانی کی شکل میں کہی ہے اور کہانی نظم کو زیادہ عام فہم بنا دیتی ہے۔ ہماری بعض بہترین نظمیں عام انسانوں کی سمجھ کی سطح سے بہت اونچی ہیں۔ لیکن ساحر کی نظم "پرچھائیاں" اپنی سادہ کہانی اور آسان بیانی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وسیع حلقوں تک پہنچ سکے گی۔ اس کے نوّے فیصدی سے بھی کچھ زیادہ الفاظ ہماری روزمرہ گفتگو کے الفاظ ہیں۔ کلاسکیت اور روایت کے نام پر ساحر نے اپنی نظم کو اجنبی اور غیر مانوس الفاظ سے بوجھل نہیں بنایا ہے۔ ساحر کی کامیابی اس میں ہے کہ اس نے اپنے سادہ اور آسان الفاظ سے اس عہد کی بعض اہم حقیقتوں کو ایسے مصرعوں میں ڈھال دیا ہے جو زبان پر چڑھ بھی جاتے ہیں اور دل پر اثر بھی کرتے ہیں۔ مثلاً جب وہ یہ کہتا ہے کہ:۔

"اس دور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے" تو وہ ایک مصرعے میں وہ سب کچھ سمیٹ لیتا ہے جو ایک پوری کتاب کا موضوع ہے۔ یہی تاثر اور گہرائی اس شعر میں ہے ؎

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا
کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں

اسی انداز سے اس نے اتنے بے پناہ اور اچھوتے مصرعے بھی

کھے ہیں۔ جیسے ؎

سنگین حقائق زاروں میں خوابوں کی ردائیں جلتی ہیں

اس نظم میں کہانی کہنے کی تکنیک بھی نئی ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے اس سے پہلے یہ تکنیک کسی اُردو شاعر نے استعمال نہیں کی اور میں جتنا غور کرتا ہوں اتنے ہی مجھے اس تکنیک کے وسیع تر امکانات نظر آتے ہیں یہ تکنیک ساحر نے براہ راست فلم سے لی ہے جس میں وہ گذشتہ چھ سال سے ایک کامیاب گیت لکھنے والے شاعر کی طرح کام کر رہا ہے۔ وہ ایک طرف خوبصورت اور کامیاب گیت لکھ رہا تھا اور دوسری طرف غالباً غیر شعوری طور سے ایک نئی تکنیک کو آہستہ آہستہ پروان چڑھا رہا تھا جس نے اب "پرچھائیاں" نظم کا روپ اختیار کیا ہے۔

یہ کہانی ایک پُرسکون چاندنی رات کے منظر سے شروع ہوتی ہے جس میں کہانی کا مرکزی کردار جو ایک دکھے ہوئے دل اور لٹی ہوئی زندگی کا فنکار ہے۔ وہ محبت کرنے والوں کو دیکھتا ہے اور اس طرح اسکی یادوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ؎

تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں، کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح

یہاں اس کی کھوئی ہوئی محبت کی بہت سی تصویریں یکے بعد دیگرے

اس کے ذہن کے پردے پر اُبھرتی ہیں اور کھو جاتی ہیں۔ ہر دو تصویروں کے بیچ میں ایک تخئیلی جست ہے جس میں پڑھنے والا شاعر کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے تصویروں کا یہ سلسلہ کامیاب محبت کے دلکش لمحوں تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور بحر کی تبدیلی کے ساتھ ایک نئے منظر کا آغاز ہوتا ہے جس میں گرد و پیش کی زندگی، جنگ اور قحط اور افلاس کے سیلاب میں ڈوب جاتی ہے جس میں نکھن سی ملائم راہیں، چرخوں کی صدائیں، چوپال کی رونقیں، پھولوں کی قبائیں غارت ہو جاتی ہیں اور وفا شعار عورتوں کے پاکیزہ جسموں کی تجارت شروع ہو جاتی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے وقت بنگال کے قحط میں یہی سب کچھ ہوا تھا۔

یہ عام زندگی کی تصویر جو ایک سیلاب کی سی کیفیت کے ساتھ ابھری تھی ختم ہوتی ہے تو مرکزی کردار یعنی لیٹے ہوئے فنکار کی محبوبہ کی دردناک تصویروں کا سلسلہ پھر شروع ہوتا ہے۔ نظم کی پہلی بحر پھر واپس آجاتی ہے اور تصورات کی پرچھائیاں بھیانک ہو کر ذہن کے پردے سے گذرنے لگتی ہیں اور اس منزل پر پہنچ کر ختم ہوتی ہیں جہاں "کسی کا کوئی نہیں آج سب اکیلے ہیں"۔

یہاں بحر پھر بدلتی ہے اور شورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام

ابھرتی ہے جہاں فنکار کی محبوبہ اپنی ساری پاکیزگی کے باوجود بک چکی ہے۔ اور فنکار روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے حاصل کرنے کے لئے در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے اور اپنی زندگی اور محبوبہ کی عصمت اور دونوں کے پیار کو نہیں بچا سکتا۔ اور اس تلخ تجربے سے گذرنے کے بعد وہ اس منزل پر پہلی بار یہ محسوس کرتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور اس کیوں کا جواب وہ بڑی ایمانداری اور خلوص سے دیتا ہے ؂

مجبور ہوں میں، مجبور ہو تم، مجبور یہ دنیا ساری ہے
اس دور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے
میں دار و رسن تک جا نہ سکا، تم جہد کی حد تک آ نہ سکیں
ہم تم دو ایسی روحیں ہیں، جو منزلِ تسکیں پا نہ سکیں

یہاں ساحر نے بڑی فنکاری سے اس ذلیل زندگی اور اس کے نظام کو بدلنے کے لئے جہد و پیکار کا ولولہ انگیز پیغام دیا ہے۔
یہیں سے ساحر کی رنگین بیانی آتش بیانی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور نظم کا آخری حصّہ شروع ہوتا ہے جس میں لٹا ہوا فنکار نئے محبت کرنے والوں کی نازک زندگیوں کو جنگ قحط اور افلاس سے بچانے کا عہد کرتا ہے اور ساری دنیا کو اس منحوس جنگ کے خلاف منظم

کرنے کی تلقین کرتا ہے ے

ہمارا پیار حوادث کی تاب لا نہ سکا
مگر انہیں تو مرادوں کی رات مل جائے
ہمیں تو کشمکش مرگ بے اماں ہی ملی
انہیں تو جھومتی گاتی حیات مل جائے!

اور اس تیسری جنگ کے خطرے کے سامنے جو ایٹمی ہتھیاروں سے لڑی جائے گی اُسے نئی محبت کرنے والی روحیں ہی نہیں بلکہ اپنی تنہائیاں اور اپنے تصورات کی پرچھائیاں بھی غیر محفوظ معلوم ہوتی ہیں اور وہ پچھلی جنگوں اور آنے والی جنگ کا تقابل اس طرح کرتا ہے ے

گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں!
گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں!

اس طرح نظم اس ذاتی تاثر کی سطح پر واپس آجاتی ہے جس سے شروع ہوئی تھی۔ نظم کا یہ خاتمہ بے حد خوبصورت اور موثر ہے ساحر لدھیانوی نے اس نظم کے ذریعے اردو کی طویل نظموں اور امن عالم کے

ادب میں ایک خوبصورت اضافہ کیا ہے۔

آج دیوالی کی رات ہے اور ہندوستان کے در و بام چراغوں سے جگمگا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ساحر کی نظم امنِ عالم کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد دے گی اور دلوں کو امن اور محبت کے چراغوں سے جگمگا دے گی۔

سردار جعفری

بمبئی

۱۳ر نومبر ۱۹۵۵ء

جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسیں پتیاں، حسیں شاخیں
لچک رہی ہیں کسی جسم نازنیں کی طرح
فضا میں گھُل سے گئے ہیں افق کے نرم خطوط
زمیں حسین ہے، خوابوں کی سرزمیں کی طرح

تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح
وہ پیڑ جن کے تلے ہم پناہ لیتے تھے
کھڑے ہیں آج بھی ساکت کسی امیں کی طرح

انہی کے سائے میں پھر آج دو دھڑکتے دل
خموش ہونٹوں سے کچھ کہنے سننے آئے ہیں
نہ جانے کتنی کشاکش سے کتنی کاوش سے
یہ سوتے جاگتے لمحے چرا کے لائے ہیں

یہی فضا تھی، یہی رت، یہی زمانہ تھا
یہیں سے ہم نے محبت کی ابتدا کی تھی

دھڑکتے دل سے، لرزتی ہوئی نگاہوں سے
حضورِ غیب میں ننھی سی التجا کی تھی
کہ آرزو کے کنول کھل کے پھول ہو جائیں
دل و نظر کی دعائیں قبول ہو جائیں

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
تم آ رہی ہو زمانے کی آنکھ سے بچ کر
نظر جھکائے ہوئے اور بدن چرائے ہوئے
خود اپنے قدموں کی آہٹ سے جھینپتی ڈرتی
خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھائے ہوئے
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رُخ پر
ندی کے ساز پہ ملّاح گیت گاتا ہے
تمھارا جسم ہر اک لہر کے جھکولے سے
مری کھُلی ہوئی باہوں میں جھول جاتا ہے
تصّورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

میں پھول ٹانک رہا ہوں تمھارے جُوڑے میں
تمھاری آنکھ مسّرت سے جھکتی جاتی ہے
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں
زبان خشک ہے آواز رکتی جاتی ہے
تصّورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

مرے گلے میں تمہاری گداز باہیں ہیں
تمہارے ہونٹوں پہ میرے لبوں کے سائے ہیں
مجھے یقین کہ ہم اب کبھی نہ بچھڑیں گے
تمہیں گمان کہ ہم مل کے بھی پرائے ہیں
تصورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

مرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو
ادائے عجز و کرم سے اُٹھا رہی ہو تم
سہاگ رات جو ڈھولک پہ گائے جاتے ہیں
دبے سُروں میں وہی گیت گا رہی ہو تم
تصورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

وہ لمحے کتنے دلکش تھے وہ گھڑیاں کتنی پیاری تھیں
وہ سہرے کتنے نازک تھے وہ لڑیاں کتنی پیاری تھیں

بستی کی ہر اک شاداب گلی خوابوں کا جزیرہ تھی گویا
ہر موجِ نفس، ہر موجِ صبا، نغموں کا ذخیرہ تھی گویا

ناگاہ لہکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں
بارود کی بوجھل بُو لے کر پچھم سے ہوائیں آنے لگیں
تعمیر کے روشن چہرے پر تخریب کا بادل پھیل گیا
ہر گاؤں میں وحشت ناچ اُٹھی ہر شہر میں جنگل پھیل گیا
مغرب کے مہذب ملکوں سے کچھ خاکی وردی پوش آئے
اٹھلاتے ہوئے مغرور آئے، لہراتے ہوئے مدہوش آئے

خاموش زمیں کے سینے میں خیموں کی طنابیں گڑنے لگیں
مکھن سی ملائم راہوں پر بوٹوں کی خراشیں پڑنے لگیں
فوجوں کے بھیانک بینڈ تلے چرخوں کی صدائیں ڈوب گئیں
جیپوں کی سلگتی دُھول تلے پھولوں کی قبائیں ڈوب گئیں

انسان کی قیمت گرنے لگی، اجناس کے بھاؤ چڑھنے لگے
چوپال کی رونق گھٹنے لگی، بھرتی کے دفاتر بڑھنے لگے!
بستی کے سجیلے شوخ جواں، بن بن کے سپاہی جانے لگے
جس راہ سے کم ہی لوٹ سکے اس راہ پہ راہی جانے لگے

ان جانے والے دستوں میں غیرت بھی گئی، برنائی بھی
ماؤں کے جواں بیٹے بھی گئے، بہنوں کے چہیتے بھائی بھی

بستی پہ اُداسی چھانے لگی، میلوں کی بہاریں ختم ہوئیں
آموں کی لچکتی شاخوں سے جھولوں کی قطاریں ختم ہوئیں
دُھول اُڑنے لگی بازاروں میں، بھوک اُگنے لگی کھلیانوں میں
ہر چیز دُکانوں سے اُٹھ کر، روپوش ہوئی تہ خانوں میں
بدحال گھروں کی بدحالی، بڑھتے بڑھتے جنجال بنی
مہنگائی بڑھ کر کال بنی، ساری بستی کنگال بنی
چرواہیاں رستہ بھول گئیں، پنہاریاں پنگھٹ چھوڑ گئیں
کتنی ہی کنواری ابلائیں، ماں باپ کی چوکھٹ چھوڑ گئیں

افلاس زدہ دہقانوں کے ہل بیل بِکے، کھلیان بِکے
جینے کی تمنّا کے ہاتھوں، جینے ہی کے سب سامان بِکے

کچھ بھی نہ رہا جب بکنے کو جسموں کی تجارت ہونے لگی!
خلوت میں بھی جو ممنوع تھی وہ جلوت میں جسارت ہونے لگی

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

تم آ رہی ہو سرِ عام بال بکھرائے
ہزار گونہ ملامت کا بار اُٹھائے ہوئے
ہوس پرست نگاہوں کی چیرہ دستی سے
بدن کی جھینپتی عریانیاں چھپائے ہوئے

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

میں شہر جا کے ہر اک در پہ جھانک آیا ہوں
کسی جگہ مری محنت کا مول مل نہ سکا!
ستمگروں کے سیاسی قمار خانے ہیں،
الم نصیب فراست کا مول مل نہ سکا

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں!

تمھارے گھر میں قیامت کا شور برپا ہے
محاذِ جنگ سے ہرکارہ تار لایا ہے
کہ جس کا ذکر تمھیں زندگی سے پیارا تھا
وہ بھائی "نرغۂ دشمن" میں کام آیا ہے!

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں!

ہر ایک گام پہ بدنامیوں کا جمگھٹ ہے
ہر ایک موڑ پہ رسوائیوں کے میلے ہیں
نہ دوستی، نہ تکلّف، نہ دلبری نہ خلوص
کسی کا کوئی نہیں آج سب اکیلے ہیں
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

وہ رہگذر جو مرے دل کی طرح سُونی ہے
نہ جانے تم کو کہاں لے کے جانے والی ہے
تمھیں خرید رہے ہیں ضمیر کے قاتل
افق پہ خونِ تمنّائے دِل کی لالی ہے
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

سُورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وُہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

اُس شام مجھے معلوم ہُوا، کھیتوں کی طرح اس دنیا میں
سہمی ہوئی دوشیزاؤں کی مُسکان بھی بیچی جاتی ہے
اُس شام مجھے معلوم ہُوا، اس کارگہِ زرداری میں
دو بھولی بھالی رُوحوں کی پہچان بھی بیچی جاتی ہے

اُس شام مجھے معلوم ہُوا، جب باپ کی کھیتی چھن جائے
ممتا کے سنہرے خوابوں کی انمول نشانی بکتی ہے!
اُس شام مجھے معلوم ہُوا، جب بھائی جنگ میں کام آئیں
سرمائے کے قحبہ خانے میں بہنوں کی جوانی بکتی ہے

سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

تم آج ہزاروں میل یہاں سے دور کہیں تنہائی میں
یا بزم طرب آرائی میں
میرے سپنے بنتی ہو گی بیٹھی آغوش پرائی میں

اور میں سینے میں غم لے کر دن رات مشقت کرتا ہوں
جینے کی خاطر مرتا ہوں
اپنے فن کو رسوا کر کے اغیار کا دامن بھرتا ہوں

مجبور ہوں میں، مجبور ہو تم، مجبور یہ دُنیا ساری ہے!
تن کا دُکھ من پر بھاری ہے
اس دَور میں جینے کی قیمت، یا دار و رسن یا خواری ہے

میں دار و رسن تک جا نہ سکا، تم جہد کی حد تک آ نہ سکیں
چاہا تو مگر اپنا نہ سکیں!
ہم تم دو ایسی روحیں ہیں جو منزلِ تسکیں پا نہ سکیں

جینے کو جیئے جاتے ہیں مگر سانسوں میں چتائیں جلتی ہیں
خاموش وفائیں جلتی ہیں!
سنگین حقائق زاروں میں، خوابوں کی ردائیں جلتی ہیں

اور آج جب اِن پیڑوں کے تلے پھر دو سائے لہرائے ہیں
پھر دو دِل ملنے آئے ہیں
پھر موت کی آندھی اُٹھی ہے، پھر جنگ کے بادل چھائے ہیں

میں سوچ رہا ہوں ان کا بھی اپنی ہی طرح انجام نہ ہو!
ان کا بھی جنوں ناکام نہ ہو
ان کے بھی مقدر میں لکھی، اک خون میں لتھڑی شام نہ ہو

سُورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

ہمارا پیار حوادث کی تاب لا نہ سکا
مگر انہیں تو مرادوں کی رات مل جائے
ہمیں تو کشمکشِ مرگ بے اماں ہی ملی
انھیں تو جھومتی گاتی حیات مل جائے

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا
کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں
بہت دنوں سے ہے یہ خبط حکمرانوں کو
کہ دُور دُور کے ملکوں میں قحط بو جائیں

بہت دنوں سے جوانی کے خواب ویراں ہیں
بہت دنوں سے محبّت پناہ ڈھونڈتی ہے
بہت دنوں سے ستم دیدہ شاہراہوں میں
نگارِ زیست کی عصمت، پناہ ڈھونڈتی ہے

چلو کہ آج سبھی پائمال روحوں سے،
کہیں کہ اپنے ہر اک زخم کو زباں کرلیں
ہمارا راز، ہمارا نہیں سبھی کا ہے،
چلو کہ سارے زمانے کو رازداں کرلیں!

چلو کہ چل کے سیاسی مقامروں سے کہیں
کہ ہم کو جنگ و جدل کے چلن سے نفرت ہے
جسے لہو کے سوا کوئی رنگ راس نہ آئے
ہمیں حیات کے اس پیرہن سے نفرت ہے

کہو کہ اب کوئی قاتل اگر ادھر آیا
تو ہر قدم پہ زمیں تنگ ہوتی جائے گی
ہر ایک موجِ ہوا رخ بدل کے جھپٹے گی
ہر ایک شاخ رگِ سنگ ہوتی جائے گی

اُٹھو کہ آج ہر اک جنگ جُو سے یہ کہہ دیں
کہ ہم کو کام کی خاطر کلوں کی حاجت ہے
ہمیں کسی کی زمیں چھیننے کا شوق نہیں،
ہمیں تو اپنی زمیں پر ہلوں کی حاجت ہے

کہو کہ اب کوئی تاجر ادھر کا رُخ نہ کرے
اب اِس جگہ کوئی کنواری نہ بیچی جائے گی
یہ کھیت جاگ پڑے، اُٹھ کھڑی ہوئیں فصلیں
اب اِس جگہ کوئی کیاری نہ بیچی جائے گی

یہ سرزمین ہے گوتم کی اور نانک کی
اس ارضِ پاک پہ وحشی نہ چل سکیں گے کبھی
ہمارا خون امانت ہے نسلِ نو کے لئے
ہمارے خون پہ لشکر نہ پل سکیں گے کبھی

کہو، کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اِس دمکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں!
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں، آسماں کی خیر نہیں!

گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گذشتہ جنگ میں پیکر جلے، مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

تصورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں